روایت شکن

مُندس جبین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

روایت شکن

سندس جبیں

عید سعید عید سعید عید سعید عید سعید عید سعید عید سعید عید سعید

وعدوں کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلیں
تھامے تمہارا ہاتھ بہت دور تک چلیں
بادل، ہوا، سراب، ستارے ہزار ہا
ہم لے کے کائنات بہت دور تک چلیں

"محترم افضل علی درگاہ شریف ضعیف علی نورانی کے نئے سجادہ نشین مقرر" میں نے فرنٹ پیج کے کونے میں لگی اس دو کالمی خبر کو بڑے دھیان سے پڑھا پھر ایک طویل سانس لے کر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اخبار میں میری دلچسپی یکسر ختم ہوچکی تھی، میں نے بمشکل ناشتہ ختم کیا اور اٹھ کر بابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، وہ بستر پر دراز تھے۔

"اچھا بابا! میں جارہا ہوں، کوشش کروں گا کہ لنچ پر آسکوں، اگر نہ آسکا تو پلیز آپ کھانا کھالیجیے گا۔ میں رحیم سے کہہ جاتا ہوں۔" میں نے اپنے ملازم کا نام لیا، وہ خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ہمیشہ ان کے یوں دیکھنے پر حیرت نما غصہ آتا تھا مگر جب سے میں نے اس کی وجہ جانی تھی مجھے الجھن نہیں ہوتی تھی، میں جانتا تھا وہ مجھ میں کیا تلاش کرتے تھے؟

آفس کے لیے نکلتے ہوئے میں نے ذہن میں Thing to do کی لسٹ چیک کی تھی اور طویل سانس

لے کر گاڑی روڈ پر ڈال دی۔ بھلا ایک اخبار کے سب ایڈیٹر کی مصروف زندگی میں کتنی فراغت ہوسکتی تھی' گیارہ بجے میری صبح ہوتی اور بارہ بجے کے قریب آفس کے لیے نکلتا تھا اور اس کے بعد یہ خیال رکھنا کہ آپ کا وقت کہاں صرف ہورہا ہے ناممکن ہی تھا۔ خبروں کو جمع کرنا' کٹر پیونٹ' ان کی ترتیب' فرنٹ لائن نیوز کے لیے کور اسٹوریز اور سب سے بڑھ کر پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کی دوڑ میں آگے بڑھنے کی جدوجہد کب گھڑی کی سوئیاں دن کے بارہ سے رات کے بارہ بجاتی پتا ہی نہ چلتا۔ بھاگتے دوڑتے لنچ' اگر کبھی خوش قسمتی سے وقت نکل آتا تو میری پہلی ترجیح یہی ہوتی کہ گھر جاکر بابا کے ساتھ کروں۔ وجہ یہ بھی تھی کہ میرے کھانے کے اوقات یکسر مختلف تھے' صبح گیارہ بجے ناشتا' آفس میں ہلکا سا لنچ اور رات لیٹ نائٹ ڈنر جو کہ مجبوری بھی تھی کہ آخر ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے آخری کاپی پریس میں بھیج کر اٹھنا ہوتا تھا اور جب میں سارے دن کی شدید محنت و سر کھپائی کے بعد گھر آتا تو بابا سوچکے ہوتے تھے ویسے بھی وہ بیمار اور ضعیف تھے۔ مجھے کبھی انہیں تکلیف دینا اچھا نہیں لگا تھا' ان ہی سوچوں میں گھرا میں آفس پہنچا تو حسب توقع میرا میز کاغذات سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے اپنی فائل ایک طرف رکھی اور ان کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ رُحمہ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آئی۔

"آپ نے مدیحہ کو فون کرنا تھا۔" اس نے کسی ریمائنڈر کی طرح مجھے یاد دلایا اور پھر جس تیزی سے آئی تھی پلٹ کر باہر بھی نکل گئی۔ میں نے ہر طرف سے ہاتھ کھینچا اور سیل فون اٹھالیا۔ مجھے اس سے بات کیے دو ہفتے گزر گئے تھے' ہمارے درمیان جیسے ایک خاموش معاہدہ تھا ایک ہفتہ میں اسے فون کرتا تو دوسرا ہفتہ وہ۔ اگر کسی وجہ سے میں معمول پر عمل نہ کرپاتا تو وہ ایسی ضدی تھی کہ کبھی خود سے رابطہ کرنا گوارہ نہیں کرتی تھی اس بار بھی یہی ہوا تھا میں نے اس کا نمبر ملایا تو کافی دیر بیل جاتی رہی' مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی مستزاد اس نے رنگ بیک ٹیون کے طور پر جو تیز میوزک والا انگلش گانا سیٹ کیا ہوا تھا اس نے میری کوفت میں مزید اضافہ کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں جھلا کر فون کاٹ دیتا اس نے کال پک کرلی۔

"کون......؟" اس کی نیند میں ڈوبی آواز سے مجھے اندازہ ہوا یقیناً محترمہ گہری نیند میں غرق تھیں۔

"ہاں اب میں تمہیں کون اور آئس کریم ہی نظر آؤں گا۔ شہزادہ گلفام تو بس وہ تیمور طارق رہ گیا ہے نا؟" میں نے الٹی چڑھائی والی پالیسی اپنانا بہتر سمجھا آخر اخبار والا جو ہوا۔ دوسری طرف سے مدھم ہنسی کی آواز آئی۔

"ویسے اس میں کوئی شک بھی نہیں۔" اس نے اترا کر کہا۔

"اس خوش فہمی سے نکلنے کا ایک طریقہ ہے میرے پاس' پلیز تم دونوں اکٹھے ہوکر آئینہ ضرور دیکھنا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں پہلوئے حور میں لنگور کی مثل کا مجسم نظر آئے گا۔" میں نے اطمینان سے اس کی خوش فہمی کا بیڑا غرق کرتے ہوئے تیمور کی ٹانگ کھینچی تھی۔ مگر وہ ذرا بھی بدمزا نہ ہوئی' ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر شہزاد تمہیں نہیں لگتا' تم نکتہ چین ہوتے جارہے ہو۔ دیکھو میرے بھائی! لوگوں کے بخیے ادھیڑو' گھر تک نہ آؤ' میرا اکلوتا شوہر ہے وہ اور ذرا شرم تم بھی کرو تمہارا اکلوتا بہنوئی ہے۔" اس نے مجھے لتاڑا' مجھے اس کے اکلوتے کی اصطلاح پر ہنسی آگئی تھی۔

"اکلوتا شوہر ہونے والی بات ذرا غلط ہے' سب کا ایک ہی ہوتا ہے البتہ میرا بہنوئی اکلوتا ہونے کا اعزاز اس کے پاس ضرور ہے ویسے وہ گھامڑ ہے کہاں؟" میں نے پھر اسے چھیڑا۔

"اچھا جی شہزاد ارسل صاحب' جرنلسٹ پلس کالمسٹ پلس ایڈیٹر صاحب! ہمیں معاف کردیجیے آپ کا بہنوئی کا اعزاز رکھنے کے بعد اس کے حواس کہاں قابو آسکتے تھے وہ عالم مدہوشی میں پڑا ہے۔" اس بار وہ اچھا خاصا جل کر بولی۔

"خواب غفلت میں؟" میرا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"اگر اب تم نے کوئی فضول بات کی تو میں فون بند کردوں گی۔" اس نے دھمکی دی اور میں جانتا تھا کہ یہ دھمکی نہیں تھی وہ واقعتاً ایسا ہی کرتی۔ میری ہنسی فوراً بند ہوئی۔

"ویسے پیاری بہنا! تم لاہور میں رہ رہی ہو اور اب تک سو رہی ہو...... حد ہے سستی کی۔" میں نے کہا۔ مدیحہ شادی کے بعد لاہور شفٹ ہوگئی تھی۔

"میری نیند کو نشانہ بنانے کی کوشش نہ کرنا' اپنی سناؤ یہ تم جیسے سڑیل' خشک اور سرد مہر اسلام آبادی نے فون کرنے کا وقت کہاں سے نکال لیا آج؟" وہ اپنی ٹون میں آچکی تھی اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"اگر میرے پاس وقت نہیں تھا تو کون سا تم نے کالز کرکر کے انگلیاں گھسالی ہیں۔" میں نے بھی بدلہ اتارا۔

"ہاں تو کیوں کرتی؟ تم بھائی ہو میرے اور وہ بھی اکلوتے' تمہارا فرض بنتا ہے میری خبر گیری کرنا۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

"ہاں بالکل' فرائض سارے میرے اور حقوق تمہارے؟" میں بلبلا کر بولا' وہ اپنے ایک سال بڑا ہونے کا فائدہ یونہی اٹھاتی تھی۔

"ہاں بالکل۔" اس کا اطمینان مجھے غصہ دلا گیا۔

"یعنی میرے حق غصب...... میں تم سے بات نہیں کررہا' فون بند کرنے لگا ہوں۔" میں نے آخری حربہ آزمایا۔

"تو کردو' تم نے کی ہے کال کون سا میں نے کی ہے۔" وہ طرح دے گئی' اس سے پہلے میں کچھ کہتا پیچھے سے تیمور کے چلانے کی آواز آئی تھی۔

"ہمیشہ والی لڑائی لڑ رہے ہو تم دونوں' اِدھر دو فون میں بات کروں۔" اس نے بلند آواز میں کہتے ہوئے فون غالباً مدیحہ کے ہاتھ سے جھپٹا تھا' میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"کیسے ہو شہزاد؟" تیمور کی آواز پر میں الرٹ ہوگیا۔

"میں ٹھیک ہوں تیمور! آپ کیسے ہیں؟" میرا لہجہ اب بدل چکا تھا' مجھے اسے آپ کہنا اچھا لگتا تھا حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں یار! مانا کہ تم دونوں بہن بھائی حسن اور خوب صورتی کے سارے استعاروں اور تشبیہوں پر پورا اترتے ہو مگر یاد رکھو خوب صورتی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی کسی کا دل بھی دیکھ لیتے ہیں۔" وہ دہائی دینے والا انداز میں بولا۔

"آپ نے ٹھیک کہا تیمور! مگر چہرے سے دل کا سفر کون کرے۔ ہم ظاہری صورت پر مرنے والی قوم ہیں۔" میرے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ دروازے سے اندر آتی رحمہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا' اس نے خاموشی سے ہاتھ میں پکڑا تراشہ میری ڈیسک پر دھرا اور باہر نکل گئی۔

"بات تو بڑی گہری کی ہے تم نے' اس پر ایک سیر حاصل بحث کی جاسکتی ہے۔ ایسا کرو لاہور آجاؤ تمہیں کباب کھلائیں گے' چکن تکا' نہاری' بریانی' حلیم' سری پائے' چار مغز...... وغیرہ کھلائیں گے پھر ڈسکس کریں گے' ٹھیک؟" ان کی ڈشز کی اتنی لمبی تفصیل (جو یقیناً باوجوہ مختصر کی گئی تھی) سن کر میں ہنس پڑا۔

"ایک بات تو بتائیں' آخر آپ لوگوں کو مرغن کھانوں کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے؟"

"یہاں بات کھانے کی نہیں' کھلانے کی ہورہی ہے احمق! تمہیں عزت راس نہیں آئی؟" اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا میں پھر سے ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے جناب! میں کوشش کرتا ہوں آنے کی مگر ڈنر چائنیز میں۔" میں نے فرمائش کی وہ بے چارہ صدمے کی شدت سے کچھ بول ہی نہ سکا' کہاں تو وہ اپنی مرغوب ڈشز کی تفصیل سنا کر مجھے آمادہ کررہا تھا اور میں نے چائنیز کی فرمائش کرکے اسے خاموش کروادیا۔

"تیرا قصور نہیں بیٹے' تو جس جگہ چلا گیا ہے نا وہاں جاکے سب کا یہی حال ہوتا ہے۔" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"کیا مطلب؟" میں حیران ہوا۔

''ظاہر ہے جب روز صبح دوسوکھے توس کھا کر کام پر جائے گا تو تمہارا انیسٹ کیسے برقرار رہ سکے گا۔ دوسرا اس شہر کی سرد آب و ہوا' اچھے بھلے بندے کو آئس برگ بنا دیتی ہے تو تو پھر اپنا بچونگڑا سا ہے۔'' وہ خاصا تپ کر بولا۔ میں پھر سے ہنس دیا اس بار وہ بھی میری ہنسی میں شامل تھا۔

ہمارا رشتہ ایسا ہی تھا' روایتی احترام و تکلفات سے آزاد...... وہ مدیحہ کو بے حد عزیز تھا اور مجھے مدیحہ...... اور کہتے ہیں جن سے محبت کی جاتی ہے پھر ان سے منسلک لوگوں سے خود بخود محبت ہو جاتی ہے اور اب تو مجھے وہ دونوں یکساں عزیز ہو گئے تھے۔ اس شخص کے پاس میرا وہ رشتہ تھا جس کے ساتھ میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت کی تھی۔ میری اکلوتی اور لاڈلی بہن مدیحہ...... میری گڑیا! اب وہ مجھ سے بابا کا حال احوال دریافت کر رہا تھا' کچھ دیر مزید بات کرنے کے بعد اس نے فون مدیحہ کو دے دیا۔

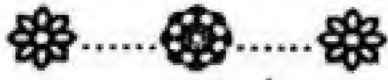
فون کے آخر میں مدیحہ پھر مجھ سے جھگڑنے لگی تھی وہی روایتی بہنوں والی فرمائش کہ میں اس کے لیے ''چاند سی بھابی'' ڈھونڈ لوں اور میں نے آخر میں پھر اسے طنز کیا۔

''تم نے میرے لیے چاند سا بہنوئی ڈھونڈا ہے جو میں ڈھونڈوں؟'' وہ چند لمحے بالکل خاموش ہو گئی حالانکہ تیمور خاصا ہینڈسم تھا مگر مدیحہ کے آنکھوں کو چندھیا دینے والے حسن و جمال کے آگے وہ ذرا دب جاتا تھا۔

''بدلہ لینے میں بالکل اپنے باپ پر گئے ہو۔'' وہ تلخی سے کہتے ہوئے فون بند کر گئی اور میرا دماغ جیسے سن ہو گیا' یہ کیا کہہ گئی وہ؟

''میں شہزاد ارسل...... اپنے باپ جیسا ہوں؟'' اور اتنے سالوں کی محنت لاحاصل؟ میرا ذہن پیچھے کی طرف بھاگنے لگا۔ میں خود کو روک نہیں پا رہا تھا' بہت چاہا اپنے سامنے پڑے پیپرز کی طرف توجہ دوں مگر بے سود......

میرے ذہن میں وہ یادیں ٹکڑوں کی شکل میں محفوظ ہیں' کسی پزل کے ٹکڑوں کی طرح۔ سارے ٹکڑے اکٹھے کرلوں تو ایک بوسیدہ سی تصویر بنتی ہے' کٹی پھٹی سی اس تصویر کے رنگ اڑے ہوئے ہیں' جب زمانے گزر جائیں تو تصویریں اور یادیں دونوں ہی دھندلی پڑ جاتی ہیں۔



چوہدری شجاعت علی ایک روایتی جاگیردار کی عملی تصویر تھے جو انسانوں کو خود سے دس فٹ کے فاصلے پر رکھ کر بات کرتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے چوہدری عارف علی اور چوہدری افضل علی اور ان کی انتھک محنت کے سبب دونوں ہی عادات و مزاج میں باپ پر گئے تھے۔ دبنگ' دوٹوک' جری' دلیر' ظالم...... ویسے بھی اگر کسی جاگیردار کے ساتھ یہ لوازمات نہ ہوں تو اسے جاگیردار کہنا ذرا اجنبی سا لگتا ہے لہٰذا وہ دونوں بھی عملی طور پر باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔ پیر شجاعت علی درگاہ شریف کے سجادہ نشین تھے۔ بڑے بیٹے عارف علی اور بہو نازش سے ان کے دو پوتا پوتی...... مدیحہ اور شہزاد تھے جبکہ چھوٹے بیٹے افضل علی سے اور بہو سے ان کی ایک ہی پوتی نورین تھی۔

نازش دونوں بچوں کی پڑھائی کے سلسلے میں شہر میں ہی رہائش پذیر تھیں جبکہ عارف علی گاؤں میں ہوتے تھے مگر ویک اینڈز پر ان کے پاس ضرور آجاتے' ان کے دونوں بچوں کی عادات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

عارف علی کی خواہش تھی کہ ان کا اکلوتا بیٹا ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہو' وہ اس میں وہ ساری عادات دیکھنا چاہتے تھے جو کہ ایک جاگیردار کے بیٹے میں ہونا چاہیے تھیں مگر کتنی حیرت کی بات تھی کہ وہ باپ کے الٹ تھا۔ کمزور صحت' سیدھا سادا اور کتابوں سے محبت کرنے والا شہزاد بالکل وہ نہیں تھا جسے وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ اسے گھڑ سوار بنانا چاہتے تھے مگر وہ گھوڑوں کو دیکھ کر ہی بدک جاتا' نہ معلوم سی نفرت تھی اسے گھوڑوں سے۔ یوں گھڑ سواری وہ اسے چاہنے کے باوجود بھی نہ

سکھا سکے اور زبردستی کا نتیجہ، بہت بھیانک نکلا تھا۔ وہ اس وقت 8th اسٹینڈرڈ میں تھا جب گھوڑے سے پھسل گیا' کمر میں بہت شدید چوٹ آئی تھی تقریباً ایک ماہ تک زیر علاج رہا اور اس کے بعد عارف علی نے توبہ کرلی تھی' کچھ بھی تھا وہ اپنے بیٹے سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے تھے وہ بھی صرف اپنی ضد اور شوق کے ہاتھوں۔

دوسرا بڑا تضاد یہ تھا کہ بہت سے روایتی باپوں کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ڈاکٹر یا کم از کم انجینئر تو ضرور بنے مگر یہ ان کی ایک اور نامکمل خواہش تھی۔ انہوں نے بڑے تپاک سے اسے ایف ایس سی میں داخلہ دلوایا' اعلیٰ سے اعلیٰ ٹیوٹر رکھ دیئے مگر نتیجہ بہت مضحکہ خیز نکلا۔ وہ شاندار طریقے سے فیل ہوگیا' وہ بہت مایوس ہوئے تھے' آدھا گھنٹہ اس کی طبیعت صاف کرنے کے بعد جب انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے تو اس کا جواب تھا۔

''میں آرٹس پڑھنا چاہتا ہوں۔'' اس کے جواب نے ان کے چودہ طبق روشن کردیئے تھے' انہیں اتنا غصہ آیا کہ حد نہیں۔

''حد ہے تم سے...... چلو اور کچھ نہیں تو بی کام وغیرہ کرلو بزنس' مارکیٹنگ کی طرف ہی آجاؤ۔ یہ زنانہ قسم کے مضمون چننا ضروری ہے؟'' وہ بھنا کر بولے تھے۔ جواباً اس کی مظلومیت بھری خاموشی سے بُری طرح چڑ گئے تھے پھر خوب بھڑاس نکالنے کے بعد وہ فیصلہ کرنے کا اختیار اسے دے کر خود وہ مکمل طور پر بری الذمہ ہوگئے تھے۔

تیسرے تضاد سے انہوں نے خود بخود سمجھوتہ کرلیا تھا' وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی ان کی طرح جری' دلیر اور بارعب ہوتا۔ ان کی طرح دبنگ اور دوٹوک لہجے میں بات کرتا مگر حسرت ہی رہی اس کا دھیما اور پُرسکون لہجہ انہیں اپنا مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ کبھی بھی ان کی پسندیدگی کی صف میں نہ آسکا تھا' وہ کبھی ان کا بیٹا نہیں بن سکا تھا خاص طور پر ویسا جیسا وہ چاہتے تھے۔

''دوسری طرف مدیحہ تھی' اس کی بہن بالکل اس کے متضاد تھی۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ وہ ایک لڑکی ہوکر ان تمام اوصاف سے مزین تھی جو وہ اپنے بیٹے میں دیکھنا چاہتے تھے۔ بہت کم عمری میں ہی وہ جان گئے تھے کہ جو اوصاف اور خوبیاں وہ شہزاد میں دیکھنا چاہتے تھے وہ مدیحہ میں تھیں۔ وہ نڈر اور بے خوف ہی نہیں دلیر اور جرأت مند بھی تھی۔ گھڑ سواری تو اس کے لیے دنوں کا کھیل ثابت ہوا تھا' عارف علی اسے بے جگری سے گھوڑے کی باگیں تھامے گھوڑا دوڑاتے دیکھتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

اس کے بعد اسُ نے شاؤٹنگ سیکھی اور پھر باپ کی خواہش کے عین مطابق میڈیکل کی فیلڈ چوز کی تھی۔ اس کے بعد تو اس نے بس جھنڈے گاڑے تھے ہر میدان میں' تیمور سے اس کی ملاقات ایم بی بی ایس کے تیسرے سال میں ہوئی تھی اور اس کے بعد بس یوں ہوا کہ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔



مدیحہ گرم کوٹ کے بٹن تیزی سے بند کررہی تھی جب اسے اپنے سیل کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی' اس نے نظر انداز کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ تمام بٹن بند کرنے کے بعد اس نے مفلر گردن اور کانوں کے گرد لپیٹا اور پھر تسلی سے سیل فون جینز کی پاکٹ سے نکالا اور یس پریس کرکے کان سے لگالیا۔

''ہاں بولو شہزاد!''

''کہاں ہو تم' کب سے کال کررہا ہوں۔'' اس کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں بس نکل رہی ہوں' تم کس طرف ہو؟ پارکنگ کی طرف؟'' مدیحہ نے شولڈر بیگ اٹھایا اور باہر کی سمت لپکی۔

''ہاں' اسی طرف ہوں۔''

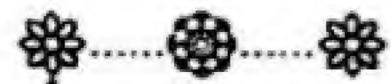
''او کے۔'' اس نے فون بند کرکے دوبارہ سے پاکٹ میں رکھا اور چل پڑی' یہ جانے بغیر کہ دو

حیران آنکھیں اس پر ساکت تھیں' یہ آنکھیں تیمور طارق کی تھیں۔

وہ اس ڈیپارٹمنٹ میں کسی سے ملنے آیا تھا مگر اس کو دیکھنے کے بعد اسی طرح واپس چلا گیا۔ دوسری بار اس نے مدیحہ عارف کو آرٹس کونسل میں دیکھا تھا اور اس بار وہ بلند آواز میں کسی کو اپنا نمبر لکھوا رہی تھی' میکانکی عمل کے طور پر تیمور کی انگلیوں نے وہ نمبر اپنے موبائل میں سیو کرلیا۔ کتنا عجیب اتفاق تھا کہ وہ ان گزرے دنوں میں یہ سوچتا رہا تھا کہ آخر وہ اس سے کیسے رابطہ کرتا؟ اب قدرتی طور پر یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا تھا۔ اور عجیب بات تھی کہ جب اگلی رات وہ اس کا نمبر ڈائل کررہا تھا تو اس کے ہاتھوں میں عجیب سی سنسناہٹ ہورہی تھی وہ ایک لڑکا تھا اور کیسے کنفیوژ ہورہا تھا؟

''ہیلو۔'' کچھ دیر بعد اس کے کانوں میں مدیحہ کی آواز آئی بہت مصروف اور قدرے تھکی ہوئی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس نے قدرے جھجک کر پوچھا اور یہ ان کا پہلا تعارف تھا۔



تیمور طارق...... ایک خالص بزنس مین اور خوف ناک حد تک حقیقت پسند......لڑکیوں کو جوتے کی نوک پر رکھنے والا' پُرغرور اور پکا میل شاؤنسٹ' جب مدیحہ عارف سے ملا تو سب کچھ بھول گیا۔ اس کی شامت ہی آئی تھی جو وہ آرٹس کونسل چلا گیا اور اب جتنا خود کو کوستا کم تھا۔ وہ لڑکی نہیں تھی لوہے کا چنا ثابت ہوئی تھی حالانکہ وہ اسے ہزار بار یقین دلا چکا تھا کہ وہ قطعاً اس کے ساتھ فلرٹ نہیں کررہا بلکہ سو فیصد سنجیدہ تھا جواباً وہ بڑا طنزیہ ہنستی تھی۔

''تیمور صاحب!'' طنزیہ انداز میں وہ ہمیشہ اسے یوں ہی مخاطب کرتی تھی اور تیمور اس کے اس انداز پر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔

''جی مدیحہ بی بی!'' وہ بھی فوراً بدلے پہ اتر آتا تو مدیحہ ہنستی چلی جاتی۔

''اُف' یوں نہ بلایا کرو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے' جیسے دادا کی درگاہ کا کوئی خدمت گار مجھے مخاطب کررہا ہو۔'' اس نے طنز کی حد کردی تھی۔ تیمور بے چارہ چپ ہی رہ گیا۔

''خدمت گار ہی رکھ لو نا......'' اس کے انداز میں دیوانہ پن تھا۔

''تم تو بے وقوف ہو یار...... خدمت گار کیوں؟ بادشاہ بناؤں گی نا تمہیں اپنے دل کی سلطنت کا' آجاؤ ناں۔'' وہ بہت آہستہ سے بول رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوابوں کے دیے جل رہے تھے۔

''ضرور آؤں گا۔'' اس نے یقین دہانی کروائی۔ جواباً وہ ایک بار پھر سے ہنس دی تھی۔ مدیحہ عارف واقعی بے وقوف تھی اسے لگتا تھا۔ اس سے اتنی بے تحاشا محبت کرنے والے بابا اس کی ہر خواہش مانتے چلے جائیں گے۔ اسے علم نہیں تھا کہ اب کی بار اس نے چوہدری عارف علی سے کیا فرمائش کرڈالی تھی۔

شہزاد نے ان دنوں اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد اخبار جوائن کیا تھا' وہ بھی ایک روایتی نوجوان تھا۔ جوشیلا' پُرجوش اور سچ کا علم بردار...... جو ایک ہی وار میں معاشرے کا نظام بدل دینا چاہتا تھا' اسے لگتا تھا اس نام نہاد اسلامی معاشرے سے ذات پات اور حسب نسب سب کا فرق مٹا دینا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر افسوس ناک بات تھی کہ اس کی آئیڈلائزیشن ٹوٹی بھی تو کب اور کس کے ہاتھوں؟

اس کے اپنے باپ کے ہاتھوں......اس کی نفسیات پر ایسی چوٹ پڑی کہ کئی ماہ وہ بیمار رہا' طوفان آیا اور بڑے زور کا آیا اور سب بہا لے گیا۔

مدیحہ کا ایم بی ایس کا چوتھا سال تھا جب اس نے بابا کے سامنے تیمور طارق کا پروپوزل رکھا تھا۔ بابا تو یہ سن کر ہی کہ ان کی یہ دلیر اور جری بیٹی کسی پر مرمٹی تھی جیسے سکتے میں آگئے تھے۔

ان کی رعونت' ان کا تکبر بھلا انہیں اجازت دیتا تھا

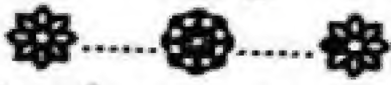
کہ وہ اپنی بیٹی کی پسند کو کھلے دل سے تسلیم کرتے؟ اور سب سے بڑی بات اس نازک موڑ پر جبکہ درگاہ شریف کی سجادہ نشینی کا فیصلہ ہورہا تھا اور قوی امکان تھا کہ یہ فیصلہ ان کے حق میں ہی ہوگا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی غیر ذات مرد سے طے کردیتے تو اس کا سیدھا سادا مطلب یہی تھا کہ ان کی وفاداری پر سوالیہ نشان اٹھایا جاتا اور کوئی بھی ان کے حق میں فیصلہ نہ کرتا بلکہ انہیں خاندان سے ہی دربدر کردیا جاتا۔ اتنے خوف ناک نتائج کی جھلک سوچ کر ہی ان کا دماغ ہل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہرممکن کوشش کی کہ مدیحہ کو بہلا پھسلا کر اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کریں مگر وہ بھی انہی کی بیٹی تھی ضد میں ان سے دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ تو اگر کسی اتھرے گھوڑے کی سواری کرنا شروع کرتی تو تب تک نہ اترتی جب تک اسے سدھار نہ لیتی‘ تو اب کیسے ہار مان لیتی۔

اور پھر دوسرا اہم کردار اس کی تربیت کا تھا جیسی اس کی تربیت کی گئی تھی بچپن سے ہی اسے حکم چلانے اور ضد منوانے کی عادت تھی اور اب وہ اپنی یہ ضد قطعاً چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ اس نے باپ کی آنکھوں میں اپنے لیے پہلی دفعہ بے زاری دیکھی اور شدید دکھ نے اس کی آنکھوں کے آگے چادر تان دی۔ ان کے انداز میں اس کے لیے محبت‘ شفقت‘ خوشی اور پیار سب کچھ مفقود ہوگیا تھا۔ وہ اس سے خوف زدہ تھے وہ اسے بتارہے تھے کہ اگر وہ اس کی شادی تیمور سے کردیں گے تو خود برباد ہوجائیں گے۔ ان کا گھر ان کی عزت‘ رتبہ‘ مقام‘ منصب اور سجادہ نشینی سب کچھ داؤ پر لگ جائے گا‘ وہ ختم ہوجائیں گے۔

جب انہوں نے یہ سارے تحفظات مدیحہ کے سامنے رکھے تو وہ چند لمحے ششدر سی انہیں دیکھتی رہ گئی پھر جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں کسی بھی قسم کی لچک قطعاً مفقود تھی۔ وہ اپنے بابا کے روبرو آ گئی‘ اس نے انہیں صاف بتادیا کہ وہ ہر صورت اپنی پسند سے شادی کرے گی خواہ اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑے‘ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ تیمور کو پسند کرتی تھی بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہر صورت اپنے باپ کی جھوٹی شان اور انا پر ضرب لگانا چاہتی تھی۔ وہ ہر صورت باپ کی ضد کو توڑنا چاہتی تھی اور یوں جب دو ضدی اور سرکش آپس میں ٹکرائے تو سب کچھ ریزہ ریزہ ہوگیا۔

اسے یاد تھا وہ دن جب تیمور کے ماں باپ مدیحہ کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ چوہدری عارف علی کی دھاڑ سے سارا گھر گونج اٹھا۔ انہوں نے تیمور کے ماں باپ کا قطعی کوئی لحاظ نہ کیا بلکہ انہیں انتہائی بدتر زبان میں بے عزت کرکے گھر سے نکال دیا۔

اصل طوفان اگلے دن آیا جب مدیحہ نے نکاح کے پیپرز لاکر ان کے سامنے پھینکے اور چیلنج کرتے ہوئے بولی تھی کہ اب وہ کیا کریں گے؟ اور انہوں نے بھی بتادیا کہ وہ اس کے باپ تھے‘ انہوں نے نازش کو طلاق دے کر اسی وقت دونوں کو گھر سے نکال دیا۔ ان کے نزدیک مسئلے کا یہ سب سے بہترین حل تھا۔



اس کے بعد کے واقعات میں شہزاد کے لیے اذیت و دکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ نازش اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کرپائیں۔ تیسرے دن تیمور کے گھر انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور ہسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں ہی ان کی ڈیتھ ہوگئی۔ شہزاد پر یہ دہرا صدمہ ٹوٹا تھا۔ لحموں میں ہنستے بستے گھر کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ قصوروار کون تھا شاید ضد اور انا...... شاید حالات؟ شاید جلد بازی اور جذباتیت میں کیے گئے اندھا دھند فیصلے یا پھر شاید سب سے بڑھ کر جذبہ انتقام.......

انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا مگر کبھی انسان بعض دفعہ اپنے مرتبے سے گرکر وہ حرکتیں کرتا ہے کہ جانوروں کو بھی مات دے دیتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بالکل بھول جاتا ہے کہ اس کے پاس تو صحیح غلط کا اختیار ہے مگر جانور تو اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ماں کی وفات کے بعد مدیحہ کا شہزاد سے رابطہ بالکل منقطع ہوگیا تھا۔

چوہدری عارف علی کی طرف سے اس پر اس قدر سخت پابندی تھی کہ اس کے فون ریکارڈ ہوتے تھے۔ شہزاد بُری طرح بے بس تھا اور سب سے بڑھ کر وہ باپ کے دست نگر تھا۔ اخبار میں نئی جاب میں آنے کے باوجود اس کی انکم نہ ہونے کے برابر تھی۔

مدیحہ کو کب پروا تھی کسی کی؟ اس کی زندگی میں کوئی غم نہ تھا۔ وہ اپنے فیصلے سے پوری طرح مطمئن تھی۔ ہاں ابتدائی کچھ ماہ وہ ماں کی ناگہانی وفات پر از حد ڈسٹرب رہی تھی مگر اس کی اسٹڈیز اور تیمور کی محبت نے اسے واپس زندگی کی طرف کھینچ لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کی زندگی میں یہ اذیت تھی کہ اس کی ماں اس کی وجہ سے اذیت برداشت کرتی اس دنیا سے چلی گئی وہ مظلوم تھیں اور ناحق وہ اپنے شوہر کے ظلم کا شکار ہوئی تھیں۔ اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت مزید بڑھ گئی تھی اس نے باپ کو کبھی معاف نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔



زندگی خاک نہ تھی خاک اڑاتے گزرنے لگی۔ مدیحہ نے خود کو مکمل طور پر مصروف کرلیا' تیمور طارق ایک بہترین ساتھی ثابت ہوا تھا۔ ایک دل گداز غم گسار اور جاں سوز محبت کرنے والا شوہر...... اسے شدت سے احساس ہوتا کہ اس کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا مگر اس کی قیمت بہت بھاری ادا کی تھی اس نے؟ اس کا گھر تو بن گیا مگر اس کے گھر کے بنتے بنتے اس کے ماں باپ کا گھر اجڑ گیا تھا۔ اسے اپنا نرم دل اور دھیمے مزاج کا پیارا سا بھائی بہت یاد آتا تھا۔

جس سے اسے بے تحاشا محبت تھی اور جو اس سے بے تحاشا محبت کرتا تھا۔ بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہوکر وہ کئی بار تیمور کے آگے رو چکی تھی۔ مگر وہ ہر بار بہت تحمل سے اسے تسلی دیتا تھا کہ......

''چیزوں کو ان کے مقام پر آنے میں وقت تو لگتا ہے نا مدیحہ! اسے وقت دو' وہ مجبور ہے اور تمہارے بابا کا اکلوتا بیٹا ہے' وہ خود غرضی کیسے دکھا سکتا ہے۔ وہ کس بنیاد پر انہیں چھوڑے؟ اور میں خود بھی ایک بیٹا ہوں' میں بھی نہیں چاہوں گا کہ وہ اپنے باپ کو چھوڑے۔'' اس نے دو ٹوک انداز میں سمجھایا تھا۔

''کم از کم تمہارا باپ میرے باپ جیسا نہیں ہے۔'' اس نے نفرت سے کہا' اس کی بات سن کر تیمور کے چہرے کا رنگ پل بھر کو بدل گیا۔

''سنو مدیحہ! ماں باپ اچھے یا بُرے نہیں ہوتے' ماں باپ صرف ماں باپ ہوتے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس دنیا میں لانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور ہمارے جیسی اولاد ساری زندگی انہیں اس قصور کی سزا دیتی ہے۔'' اب کی بار تیمور کا لہجہ تلخ تھا' مدیحہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے میں مانتی ہوں کہ ماں باپ غلط نہیں ہوسکتے۔ مگر جو میرے بابا نے کیا وہ قطعی غلط تھا۔ کم از کم ان کی سفارش نہیں کرسکتے۔'' اس نے ٹوکا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو مگر کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا۔'' تیمور نے جتایا۔

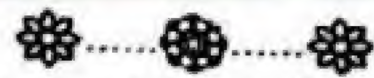
''مگر شعوری غلطی اور تکبر کی حرص میں انسان کبھی مکمل نہیں ہوتا۔'' وہ کہاں پیچھے ہٹنے والی تھی۔

''تم نے بھی تو ضد اور غرور میں آکر انہیں نیچا دکھایا تھا۔'' وہ دوبدو بولا' جواباً مدیحہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے میں نے غلط قدم اٹھایا صرف انہیں نیچا دکھانے کے لیے؟ اور میری تم سے محبت اسے کسی کھاتے میں نہیں لاتے تم......'' وہ غرا کر بولی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' تیمور گڑبڑایا۔

''تمہارا جو بھی مطلب تھا' اگر آئندہ تم نے مجھے اس حوالے سے لعن طعن کرنے کی کوشش کی تو انجام یاد رکھنا۔ میں روایتی لڑکی نہیں ہوں جو یہ ذہنی ٹارچر برداشت کروں گی۔ میں تمہیں تمہارے والدین کے ساتھ چھوڑ کر بخوشی چلی جاؤں گی۔ مجھے اپنے فیصلے لینے آتے ہیں اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔'' اس کا لہجہ بے لچک اور سرد تھا۔



اس کا ایم بی بی ایس کا آخری سال تھا' جب شہزاد کا اس سے رابطہ بحال ہوا تھا۔ وہ بے پناہ خوش تھی' اسے اپنا اکلوتا رشتہ واپس مل گیا تھا' تیمور بھی خوش تھا مگر افسوس ناک بات یہ تھی کہ شہزاد نے ابھی تک بابا کو نہیں بتایا تھا' اس نے ان سے چھپا کر مدیحہ سے رابطہ رکھا تھا۔ مدیحہ کو جب اس بات کا پتا چلا تھا تو وہ شہزاد سے خوب جھگڑی تھی' مگر جانتی تھی وہ بھی بے بس تھا اس لیے جل کڑھ کر خاموش بیٹھ گئی۔

زندگی کتنی عجیب چیز ہے' ساری زندگی ہم رشتوں کی قدر نہیں کرتے اور جب بھی رشتے ہم سے دور چلے جاتے ہیں تو پھر ہمیں ان کی قدر آتی ہے۔

مدیحہ کے لیے بھی شہزاد صرف بھائی تھا مگر جب وہ سسرال گئی تب اسے شہزاد کی اہمیت پتا چلی تھی۔ اب وہ حقیقتاً اس کا سرمایہ اس کا ماں جایا بنا اور اسے احساس ہوا کہ رشتے زندگی کے لیے کتنے ضروری تھے۔ زندگی کا کوئی بھی اہم لمحہ رشتوں کے بغیر قطعی قابل قبول نہیں ہوتا۔ نہ رمضان نہ عیدیں' نہ کوئی مقامی تہوار کچھ بھی' اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔

اس بار رمضان آنے پر مدیحہ کو ماں کی بے حد یاد آئی تھی' جب بھی وہ صبح تیمور کو سحری کے لیے جگاتی وہ بمشکل جاگتا اور اذان سے دس منٹ پہلے جاگنے کی وجہ سے جلدی جلدی میں بس چند نوالے ہی لے پاتا اور یہ سب ہوتا بھی اس کی اپنی وجہ سے ہی تھا۔ وہ اسے اگر جلدی جگانے آجاتی تو بے حد غصہ کرتا اور یہ آرڈر بھی اسی کا جاری کردہ تھا کہ بس دس منٹ پہلے جگایا جائے' سحری کرتے ہوئے بھی دونوں کی نوک جھونک چلتی رہتی۔ تیمور کی بند ہوتی آنکھیں اور جمائیاں اسے غصہ دلاتی تھیں' اوپر سے اس کے غصہ دلاتے کمنٹس......

''یہ سحری کا وقت تھوڑا زیادہ نہیں ہوسکتا؟''

''زیادہ ہی ہے' جلدی اٹھا کرو۔'' وہ جتاتی۔

''کتنی جلدی اٹھوں؟'' وہ خفگی دکھاتا۔

''جلدی سوؤ گے تو جلدی اٹھو گے ناں' تمہیں کون کہتا ہے رات ایک بجے تک لیپ ٹاپ سے چپٹے رہو۔'' مدیحہ نے طنز کیا تو تیمور تڑپ اٹھا۔

''میں کام کررہا تھا۔''

''تو دن میں ختم کیا کرونا اپنے کام۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

''کاش سحری بھی دن میں ہوسکتی۔'' اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا تو مدیحہ نے اس کے بازو پر ایک سخت مکہ مارا۔

''شرم کرو۔'' اس کے شرم دلانے پر وہ ہنس پڑا۔

رمضان میں مدیحہ کی روٹین میں ہنگامی تبدیلی آتی تھی' عبادات اور اذکار کا خصوصی اہتمام کرنا اس نے ماں سے سیکھا تھا اور یہ پہلا رمضان بھی تو تھا جس میں وہ ماں کے بغیر تھی اور شہزاد سے بھی تو دور تھی۔

حسب معمول کافی دن سے شہزاد کی کال نہیں آئی تھی اور اسی حساب سے مدیحہ نے بھی غصے میں آکر نہیں کی تھی جب کہ تیمور نے بارہا اسے کہا تھا کہ انا کو چھوڑ کر اسے اپنے بھائی کو منا لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے وہ مصروف ہو' جس کا جواب مدیحہ نے عین اس کی توقع کے مطابق دیا تھا۔

''میں ڈاکٹر ہوں اور اس سے زیادہ مصروف ہوں' وہ ایک سیکنڈ کلاس اخبار کا انچارج بن کر مجھ سے زیادہ مصروف نہیں ہوسکتا۔'' اس نے خشک انداز میں اس کی بات کاٹی تھی تیمور نے بغور اسے دیکھا۔

وہ تمہارا بھائی ہے مدی!'' اس نے جیسے یاد دلایا۔

''میں جانتی ہوں بہت اچھی طرح سے۔'' وہ افطار کی تیاری کے لیے جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی۔ تیمور نے بڑی حیرانی سے اسے دیکھا' وہ اپنے بھائی کے لیے بھی ویسی ہی ضدی تھی۔

''وہ تمہارا اکلوتا بھائی ہے۔'' تیمور نے قدرے تاسف سے کہا' زور ''اکلوتا'' پر تھا۔

''تو کیا......؟'' اس نے پلیٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے

بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''تمہاری ضد بہت بُری ہے مدی!'' اس نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے نا' مجھے ضد کیوں دلائی اس نے؟'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''اس کی کوئی مجبوری بھی تو ہوسکتی ہے۔'' اس نے سمجھانا چاہا۔

''مجھے مجبوریوں سے ویسے ہی نفرت ہے۔'' اس نے ٹیبل پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''اور اگر کبھی میرا تم سے کلیش ہوجائے تو تم میرے ساتھ بھی یہی کرو گی؟'' اس نے قدرے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''آف کورس......'' اس نے پانی کی بوتل رکھتے ہوئے اپنی ازلی بے نیازی سے کہا۔ تیمور چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

افطار میں صرف چند منٹ باقی تھے جب ہی وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکی وہ لاؤنج کراس کرکے باہر نکل رہا تھا۔

''تیمور! کیا بات ہے' کہاں جارہے ہو؟'' اس نے اسے آواز دیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔'' وہ ناراضگی سے کہتا واپس مڑ گیا' مدیحہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

''کیا ہوا؟ ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟ تم ایک دم سے کہاں جارہے ہو؟''

''تمہارے نزدیک گدھا گھوڑا برابر ہے' مجھے اپنی ضد کی بھینٹ چڑھانے سے پہلے اتنا سوچ لینا کہ میں کون ہوں؟ میں تمہارا شوہر ہوں مدیحہ!'' غصے سے بھڑکتے ہوئے وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔

''اوکے...... فائن۔'' اس نے تسلی آمیز انداز میں اس کا بازو چھوڑا اور ایک طرف ہوگئی۔

''میں آئندہ اسے یاد رکھوں گی' اب اندر چلیں؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی' تیمور بھی سر ہلا کر اندر کی طرف بڑھ آیا۔ افطار کرتے ہوئے وہ دونوں خاموش تھے۔

''ویسے مجھے تمہارے اتنے عجیب ردعمل کی سمجھ نہیں آئی؟'' مدیحہ نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ تیمور نے اپنی پلیٹ سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''مجھے بہت غصہ آیا تھا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا' مدیحہ کچھ کہنے کی بجائے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے ہماری شادی نارمل حالات میں نہیں ہوئی' مگر میں تمہاری عزت کو سب سے پہلے رکھتا ہوں مدیحہ! محبت اپنی جگہ ہے مگر اس کے باوجود آج تک میرے لب پر ایسی کوئی بات نہیں آئی جس سے تم ڈس گریس ہو مگر تمہارے وہ الفاظ سن کر مجھے لگا میں تمہارے نزدیک ذرا بھی قابل احترام و قیمتی نہیں ہوں۔'' اس کا لہجہ انتہائی افسردہ تھا۔

''ایم سوری! اگر تمہیں ایسا لگا تو......'' مدیحہ نے آہستگی سے کہا اور اسی رات جب وہ نماز پڑھ کر لوٹا تو مدیحہ لیپ ٹاپ بند کرکے اس کے پاس آگئی۔

''تیمور......'' اس نے بلایا۔ وہ جوائے سی کی اسپیڈ فل کررہا تھا' چونک کر پلٹا۔

''ہوں......'' اس نے بستر کی طرف جاتے ہوئے کہا' اب وہ تکیے سیدھے کرکے لیٹ رہا تھا۔

''مجھے بات کرنی ہے۔'' وہ بولی۔

''مجھے سونا ہے۔'' وہ سائیڈ کروٹ لے چکا تھا۔ مدیحہ نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کی پشت کو دیکھا۔

''میں کہنا چاہتی ہوں کہ میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔'' اس نے تیمور کے ماتھے کو چوما اور اٹھ گئی' تیمور کی آنکھیں کھل گئیں۔

''مدی......'' اس نے آواز دی' وہ اس کی طرف پلٹ آئی۔

''ادھر آؤ۔'' اس نے ہاتھ آگے کیا' مدیحہ اس کا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تیمور نے دیکھا اس

کی آنکھوں میں نمی تھی اُسے افسوس ہوا۔
''ایم سوری یار!'' اس نے مدیحہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔
''اٹس او کے۔'' وہ مہارت سے اپنے آنسو پی گئی۔ تیمور نے بھی بات کو لمبا کرنا مناسب نہ سمجھا تھا' وہ صرف اس وقت اس کا موڈ بدلنا چاہ رہا تھا۔
''شہزاد کے پاس چلیں گے عید پر؟'' اس نے کہا' مدیحہ نے حیران ہوکر اس کا چہرہ دیکھا۔
''واقعی......؟''
''ہاں' میں نے سوچا ہے یہ تمہاری پہلی عید ہے' اس لیے اسے ہم شہزاد کے ساتھ منائیں گے۔'' وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔
مدیحہ نے دل کی اداسی کو چھپا کر سر ہلا دیا' اسے جانے کیوں بابا بے حد یاد آئے تھے۔



بابا کی طبیعت بہت خراب تھی' وہ پچھلے کئی دنوں سے ہسپتال میں تھے اور ان کی بیماری کی وجہ سے شہزاد کی ساری روٹین الٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس کے لیے گھر' اسپتال اور اخبار کو مینج کرنا ایک مسئلہ بنتا جارہا تھا مگر وہ تا حال اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ ایسا ہوا کیوں کرتا۔
ملازم اگلے دن ان کے کمرے کی صفائی کرکے لوٹا تو ہاتھ میں ایک اخبار تھا' شہزاد کی نظر جب اخبار پر پڑی تو لمحوں میں ساری کہانی اسے سمجھ آگئی۔ تو یہ وجہ تھی ان کی ایک دم بیماری کی...... اس کے اندر ویرانی اتر آئی۔
یہ وہی اخبار تھا جس میں اس کے چچا کی سجادہ نشینی کی خبر لگی تھی اور اس دن وہ اپنے بیمار باپ کو دیکھتے ہوئے یہی سوچتا رہا کہ خواہشات کیا واقعی انسان کو اس طرح سے غلام بنالیتی ہیں کہ وہ کچھ بھی یاد نہیں رکھتا۔ اس کی اپنی پیدا کی ہوئی اولاد بھی اس کے نزدیک غیر اہم ہوجاتی ہے' کیا چاہتے تھے وہ اور کیا ملا تھا انہیں؟ انہیں نازش سے بہت پیار تھا اور یہ ایک حقیقت تھی کہ انہوں نے اپنی بیوی کے علاوہ کبھی کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ دو ہی اولادیں تھیں مدیحہ اور شہزاد! اگر شہزاد نے ان کی امیدوں پر اچھا خاصا پانی پھیرا تھا تو مدیحہ نے سچ مچ ان کا بیٹا بن کر دکھایا تھا۔ ان کی ہر خواہش پوری کی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ شہزاد سے کم پیار کرتے تھے اور مدیحہ سے زیادہ۔ محبت تو انہیں دونوں سے بے حد تھی مگر ہاں یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ مدیحہ کو زیادہ پسند کرتے تھے مگر اس سے بھی زیادہ انہیں ایک اور چیز پیاری تھی اور وہ تھی ''اقتدار کی کرسی'' درگاہ کی سجادہ نشینی۔
اور ہوا کیا؟ ان کے ہاتھ سے ہر چیز نکل گئی۔ اپنی اندھی خواہشات کی تقلید میں سب سے پہلے انہوں نے اپنی عزیز ترین ہستی' اپنی شریک حیات کو کھویا جس کے بغیر جینے کا تصور بھی کبھی نہ کیا تھا' اسے اپنے ہاتھوں سے گھر سے نکال دیا اور بہت بے دردی سے اس کے نام کے آگے سے اپنا نام الگ کردیا...... انہیں اپنی بیٹی مدیحہ پر بہت ناز تھا اور انہوں نے ہمیشہ اس کی ہر خواہش کو پورا کیا تھا جب اس کی زندگی کے اتنے اہم فیصلے کا وقت آیا تو اپنی غرض نے انہیں اندھا کردیا۔
انہوں نے بے رحمی سے اس کی بات ماننے سے انکار کردیا اور پھر جب اپنی مرضی کرکے ان کے سامنے آئی تو انہوں نے اسے بھی گھر سے نکال دیا۔ مگر ایسا کرکے بھی انہیں کب سکون آیا تھا بلکہ انتقام تو خاک لینا تھا' الٹا وہ ایسا بے سکون ہوئے کہ ہر چیز سے دل اُچاٹ ہوبیٹھا۔ انہیں نازش بے حد یاد آتی تھیں' انہیں مدیحہ بے حد یاد آتی تھی۔
مگر نازش سے تو وہ رشتہ ختم کرچکے تھے اور کس قدر افسوسناک خبر تھی ان کے لیے کہ انہوں نے نازش سے رشتہ ختم کیا اور وہ دنیا سے ہی رشتہ توڑ گئیں اور رہی مدیحہ...... ان کی لاڈلی اور ضدی بیٹی...... کبھی کبھی ان کا دل چاہتا وہ اس سے اپنی ساری ناراضگی ختم کرکے اس کے گھر چلے جائیں' اس کے شوہر سے ملیں۔ اسے دیکھیں کہ وہ کیسا شخص تھا جس نے ان کی بیٹی کو ان کے سامنے لاکھڑا کیا تھا کہ وہ اس قدر جرأت مند ہوگئی کہ از خود نکاح کرکے ان کے سامنے

نکاح نامہ لے کر آ گئی۔
ہاں یہ سچ تھا‘ کبھی کبھی وہ انہیں بے حد‘ بے حساب یاد آتی تھی‘ وہ اسے یاد کرتے کرتے نڈھال سے ہو جاتے۔ انہیں وہ اسی طرح اپنے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی‘ ہنستی بولتی ان سے لاڈ کرتی‘ اپنی باتیں منواتی اور وہ اپنی جاگتی آنکھوں سے یہ خواب دیکھتے دیکھتے نڈھال ہو جاتے۔

انا کی جنگ میں ہم جیت تو گئے لیکن......!
پھر اس کے بعد بہت دیر تک نڈھال رہے



وہ بڑی دیر تک خالی الدماغ آفس میں بیٹھا رہا پھر اس نے مدیحہ کو فون کیا۔
”ایک اہم میٹنگ کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔“ اس کا لہجہ عام سا تھا‘ مگر پھر بھی مدیحہ کا چونکنا لازم تھا جبکہ دو دن بعد عید تھی۔
”یوں اچانک...... خیریت؟“ اس کا لہجہ کھوج والا تھا۔
”ہاں‘ بس ایک دم ہی پتا چلا‘ اس لیے آفس سے ہی نکلنا پڑے گا۔“ اس کا انداز پہلے سے بھی بڑھ کر بے پروا تھا۔
”واپسی کب ہے؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔
”کل تک آ جاؤں گا۔“
”آج کیوں نہیں؟“
”بہت مشکل ہے آج؟“
”کوشش بھی نہیں کرو گے؟“
”ہاں‘ کوشش پوری کروں گا۔“
”مجھے مس کرو گے؟“ مدیحہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
”بہت......“ وہ شدت سے بولا۔
”تم بھی ساتھ چلو۔“
”ممکن نہیں۔“
”کیوں؟“
”بہت مصروف روٹین ہے آج کل‘ نکل نہیں سکوں گی۔“
”میرے لیے بھی نہیں؟“ اس نے جیسے چیلنج کیا۔ چند لمحے خاموش رہی پھر جیسے فیصلہ ہو گیا۔
”تم میرے ہسپتال آ ؤ گے یا میں تمہیں آفس سے پک کرلوں؟“ وہ دبی مسکان سے کہہ رہی تھی۔ تیمور کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔
”چلو اسی خوشی میں تمہیں عید کی شاپنگ بھی اسلام آباد سے کرواؤں گا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
”ضرور‘ میری پہلی عید ہے شادی کے بعد‘ میں کون سا سستے میں چھوڑوں گی تمہیں۔“ اس نے دھونس سے کہا اور فون بند کر دیا۔



عید آتی ہے دل دکھاتی ہے
یاد بچھڑے ہوؤں کی لاتی ہے
جن سے ملنے کا آسرا ہی نہیں
عید ان کا خیال لاتی ہے

وہ پچھلے چھ دن ہاسپٹلا ئزر رہنے کے بعد آج ہی گھر آئے تھے اور گھر انہیں کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔
شہزاد بے چارہ بھی اپنی ساری روٹین کو پس پشت ڈالے اس دن سے ان کی تیمارداری پر لگا ہوا تھا اور اب وہ سوچتے تھے کہ کتنا اچھا ہوا کہ ان کا بیٹا ویسا نہیں تھا جیسا وہ چاہتے تھے۔ اگر وہ ویسا ہوتا تو کبھی ان کا اتنا خیال نہ رکھ پاتا‘ یہ تو اس کے اندر اللہ نے اتنی خوبیاں رکھ دی تھیں جس کی وجہ سے وہ اس بڑھاپے اور بیماری کی حالت میں بھی بڑی عزت سے اس کے ساتھ تھے۔
آج انہیں محسوس ہوا تھا کہ اس کی نرم دلی‘ ہمدردی اور خلوص اتنے بے قیمت نہ تھے جتنے وہ خیال کرتے تھے۔
عید میں بھی کچھ ہی دن تھے مگر وہ لامحدود اداسی جو ان کے اندر رچی بسی ہوئی تھی اس کا تو کوئی اختتام ہی نہ تھا......
کاش ممکن ہو پاتا جو وہ سوچتے تھے۔ اس عید پر انہیں اپنی بیٹی کی پیاری صورت دکھ سکتی وہ تنہائی میں کئی بار رو پڑے

تھے۔ مگر کتنا عجیب لگتا تھا کہ وہ شہزاد سے کہتے کہ وہ مدیحہ کو منا لائے وہ اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ کیسے کہتے' وہ تو انا پرست تھے۔

شہزاد بڑے دنوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا' وہ بے خبر نہیں تھا وہ باپ کی بے چینی کا ماخذ جانتا تھا۔



ایک ریسٹورنٹ کے اندرون ماحول کا منظر تھا' ارد گرد ایک مخصوص چہل پہل تھی جو کہ عید سے تعلق رکھتی تھی۔

''مجھے آج میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک تھی۔

''وہ کیسے؟'' وہ ہنسا۔

''آپ سے ملنا بھی خوشی ہے مگر اصل خوشی مجھے آپ کے خیالات جان کر ہوئی ہے' آج کل ایسا کون سوچتا ہے؟ جیسا آپ کا دل ہے ویسا تو کسی کا ہوتا ہی نہیں۔'' وہ توصیفی انداز میں کہتا ہوا آخر میں اس کا ہاتھ تھام گیا۔ تیمور بے ساختہ ہنس پڑا۔

''مجھے تم سے زیادہ خوشی ہے شہزاد! تم اندازہ نہیں لگا سکتے میں کتنے خدشات لے کر آیا ہوں یہاں پر۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں تم سے مل پاؤں گا یا نہیں' یہ بھی بات واضح نہ تھی کہ تم مجھے قبول کرو گے یا نہیں۔ اگرچہ میں تم سے بے شمار بار فون پر بات کر چکا تھا اور تمہارا رویہ ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا تھا' مگر اس کے باوجود یہ بات بھی حقیقت تھی کہ میں تیمور طارق ایک ناگوار حادثے کی صورت میں آپ کے خاندان کا حصہ بنا تھا۔ میں بھی اسی دنیا میں رہتا ہوں جانتا ہوں کہ ایسے رشتوں کی کوئی وقعت' کوئی حیثیت نہیں ہوتی مگر پھر بھی میں اس لیے یہاں آیا ہوں تاکہ کوئی تو روایت بدلے کوئی تو ان بدنما زنجیروں کو توڑے جن میں ہم سب قید ہیں۔ ہماری شادی کوئی نارمل حالات میں نہیں ہوئی اور اسے آپ کی فیملی میں اور معاشرے میں سماجی مقبولیت ملنے میں بہت وقت لگے گا مگر پھر بھی میں چاہتا ہوں ہم اس کا آغاز تو کریں' ہم پہلا قطرہ تو بنیں۔ میں یہ باتیں اس لیے نہیں کر رہا کہ میں خود کو اچھا ثابت کر سکوں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری فیملی مکمل ہو۔ میں اکلوتا ہوں اور شاید کہیں اندر یہ حرص رکھتا ہوں کہ آپ جیسا بھائی مل جائے اور شاید کہیں اندر یہ لالچ بھی ہے کہ بیوی کے ساتھ بیوی کا سسرال بھی ملے مگر ان سب باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے مجھے درحقیقت مدیحہ کی خوشی عزیز ہے۔ آپ کے بغیر ہماری زندگی ہماری خوشی ادھوری ہے...... آپ جانتے ہیں کہ میری شادی کوئی روایتی عشق و محبت کا نتیجہ نہیں' یہ تو صرف مدیحہ کی ضد اور غصے کا نتیجہ ہے جو اسے اپنے بابا سے تھی مگر اب کافی وقت گزر چکا ہے میں چاہتا ہوں اب سب نارمل ہو جائیں۔ رشتوں کے بغیر زندگی گزر جاتی ہے مگر اس میں خوشیوں کے رنگ پھیکے ہوتے ہیں۔'' تیمور اپنی بات ختم کر کے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو کہ خاموش تھا۔

''بھائی صاحب! آپ کنوینس ہو گئے یا میں اور بولوں؟'' تیمور نے اسے خاموش دیکھ کر چٹکلا چھوڑا' دونوں کا قہقہہ بے اختیار تھا۔



عید میں بس دو دن تھے' گھر میں عجیب سی ہلچل تھی۔ بات ہی ایسی تھی گاؤں سے چچا افضل آئے تھے اور خاصی دھوم دھام سے ملازموں اور گارڈز کے جلوس میں آئے تھے' مٹھائیوں کے ٹوکرے اور پھلوں کے کریٹ اتنے تھے کہ صحن بھر گیا۔ وہ کئی کاموں کے لیے آئے تھے سب سے پہلے عید کی مبارک دینے...... ان کی صحت یابی کی خوشی میں...... پھر اپنی سجادہ نشینی کی مبارک لینے...... اور پھر سب سے اہم کام' شہزاد کے لیے اپنی بیٹی شازمین کا رشتہ لے کر۔

مبارک باد دی گئی اور لی بھی گئی' مٹھائی کھائی اور کھلائی گئی مگر جہاں بات شہزاد کی شادی کی آئی وہاں چوہدری عارف ہچکچا گئے۔

''میں یہ فیصلہ ذاتی طور پر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں افضل! میرا ایک بیٹا ہے اور وہ عام لوگوں سے بہت

مختلف ہے۔ اس کی سوچ مجھ سے بالکل الٹ ہے میں اس کی رضا جانے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔'' ان کا لہجہ شہزاد کی محبت سے لبریز تھا۔ چوہدری افضل کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا مگر وہ ضبط کر گئے' اسی شب یہ قافلہ واپسی کو روانہ ہوا۔ اگلی صبح بڑی روشن اور چمک دار تھی اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔



دو دن سے مسلسل وہ اسے شاپنگ کروا رہا تھا' دوسرے لفظوں میں جی بھر کے اسے خوش کر رہا تھا۔ اسے خوب گھمانے کے بعد اور دل بھر کے چاند رات سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ دونوں واپس جا رہے تھے۔ گاڑی بڑے جانے پہچانے راستے پر چلنے لگی تو مدیحہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے بے چینی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''گھر......'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''کس کے گھر؟''

''اپنے گھر مدی...... ہمارے گھر۔'' اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ مدیحہ کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی مگر وہ اب کی بار خاموش رہی اور کچھ دیر بعد اسے واقعی ''اپنا گھر'' نظر آ گیا اس نے گاڑی روک دی۔

''تیمور......'' اس کی آواز کپکپا گئی۔ تیمور نے ایک بار پھر اسے مسکرا کر تسلی آمیز انداز میں دیکھا اور سر ہلا کر اس کا ہاتھ تھپکا۔

''آؤ' سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آیا۔

گیٹ وا کر دیا گیا' پورچ میں ہی شہزاد ان کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ مدیحہ کی آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی گہری دھند تھی' وہ بے ساختہ دوڑ کر اس کے ساتھ لگ گئی۔ شہزاد اپنی آنکھوں کی نمی چھپا کر اسے تسلی دے رہا اور پھر وہ سب اندر چلے گئے' اس نے بابا کو دیکھا جو کہ بستر پر تھے اور وہ کتنے کمزور اور نحیف تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا' وہ ان کا ہاتھ تھامے کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئے تھے اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ انہوں نے بڑی فراغ دلی سے تیمور کو سینے سے لگایا اور یہ ان کی اس رشتے کی قبولیت کا اعلان تھا۔

مدیحہ بے حد حیران تھی وہ تو سوچتی تھی کہ بابا کسی صورت تیمور کو قبول نہ کریں گے بلکہ جب وہ اندر داخل ہوئے تو کہیں اندر سے اسے یقین تھا کہ بابا تیمور کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھیں گے مگر جیسا اس نے سوچا ویسا کچھ نہ ہوا اور جو ہوا تھا وہ اس کے گمان سے بالاتر تھا......

وہ بے انتہا خوش تھی اور کہیں اندر سے اس اچانک تبدیلی پر حیران بھی تھی آخر یہ سب ہوا کیسے؟ اس کے اندر کئی سوالات کلبلا رہے تھے مگر فی الوقت وہ ایسا کچھ بھی پوچھ کر ماحول اور موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔



آج پہلی بار وہ اس کے گھر اس کے کمرے میں آیا تھا اور مدیحہ کی خوشی اس کے چہرے سے چھلکی رہی تھی۔ وہ اسے ایک ایک چیز دکھا رہی تھی اسے اپنے بچپن کی باتیں اس گھر اور کمرے سے جڑی اپنی ساری یادیں سنا رہی تھی اور وہ سن رہا تھا...... آج پہلی بار اس نے مدیحہ کو اتنا بولتے سنا تھا اور اسے یوں بلا تکلف' بنا رکے بولتے سننا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اسے کتنا چاہتا تھا اور اگر وہ اسے اس کے والدین سے نہ ملواتا تو شاید خوشیوں کے یہ رنگ مدیحہ کے چہرے پر کبھی نہ دیکھ پاتا۔ اس کی یہ مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک کبھی اتنی تاباں نہ ہوتی اور اس نے سوچا کہ فقط ایک انا کا سر کچل کر اس نے زندگی کی کیسی انمول خوشی پائی تھی۔



سوچ بدلنا' دل بدلنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس کا اندازہ انہیں تب ہوا جب انہیں اپنی فرسودہ' گھسی پٹی سوچ بدلنا پڑی۔ مدیحہ کی دفعہ انہوں نے ضد اور انا میں آ کر سب کچھ برباد کر دیا تھا مگر اب معاملہ بالکل

مختلف تھا۔ اب مقابلہ ان کے حساس اور فرماں بردار بیٹے شہزاد سے تھا‘ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے کہا کہ وہ اس کے چچا کو ہاں کر چکے ہیں تو وہ کسی صورت انکار نہیں کرے گا لیکن پھر انہوں نے سوچا کہ وہ ایسا کیوں کریں‘ وہ ان کا بیٹا جس نے اب تک ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا تھا‘ ان کے لیے دن رات کا فرق بھول گیا تھا۔ ان کی تیمارداری ہی نہیں کی بلکہ ہر ممکن دل جوئی بھی کی تھی اور اب یوں ایک دم وہ اس پر اس کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ تھوپتے تو یہ کس قدر ظلم ہوتا اور سب سے بڑا اس کا احسان‘ مدیحہ کو واپس لے کر آیا تھا‘ کیسے ان کے اندر کی بات جان گیا تھا۔ وہ کیسے یہ راز پا گیا تھا کہ وہ مدیحہ کے لیے تڑپ رہے تھے وہ واقعی ان کا پیارا بیٹا ان کو سمجھنے والا تھا جو ان کی تڑپ کو پا کر بھی انہیں جتائے بغیر مدیحہ کو ان کے لیے واپس لے آیا تھا۔

ان کے دل سے اس کے لیے دعائیں نکلتی تھیں ”اے اللہ! آپ میرے پیارے بیٹے کو دونوں جہانوں کی کامیابی عطا کیجیے گا‘ اسے وہ سارے سکھ دیجیے گا جو وہ دوسروں کو دیتا ہے‘ آمین۔“ اور یہی ان کا فیصلہ تھا کہ اب کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر نہ ہوگا اور جب سب لوگ بہت خوش خوش کھانا کھانے کے بعد سونے گئے تو انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔

”بیٹھو بیٹے! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جی بابا!“ وہ بیٹھ گیا۔

”تم آگاہ ہو کہ تمہارے چچا کیا مدعا لے کر آئے تھے‘ میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا کیونکہ میں اس کا اختیار تمہیں سونپتا ہوں۔ میں نے مدیحہ کو شیروں کی طرح پالا تھا‘ پھر پتا نہیں کیوں اسے غلام کرنا چاہا۔ زبردستی اس کے گلے میں رسی ڈالنی چاہی‘ جب ساری زندگی اسے اپنی مرضی کی اجازت دی تھی تو اب جانے کیوں اس پر آمریت جھاڑنی چاہی مگر ایسا نہ ہو سکا وہ شیر تھی اور شیر ہی رہی۔ اس نے جھکنا سیکھا ہی نہیں مگر جانے میں نے کیوں اسے جھکانا چاہا؟ وہ جھک تو نہ سکی ٹوٹ گئی۔ اب جبکہ بڑی مشکل سے سب ٹھیک ہوا ہے‘ میں تمہیں ٹوٹتا نہیں دیکھ سکتا۔ تم میری قیمتی متاع ہو‘ میں تم پر کسی صورت اپنی مرضی نہیں ٹھونسنا چاہتا‘ فیصلہ تمہارا ہوگا۔“ وہ اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گئے۔



وہ ادھوری‘ بوسیدہ اور ٹوٹی بکھری تصویر آج بڑی مکمل اور خوشنما سی میرے سامنے ہے۔ میں نے تعقبے لگاتی مدیحہ کو دیکھا جس کی خوشی مکمل تھی‘ پھر تیمور کو جو کہ بڑا آسودہ اور پُرسکون نظر آتا تھا اور جس کی والہانہ نظر جب مدیحہ پر پڑتی تھی تو آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ پھر میں نے ہولے ہولے انہیں سارا معاملہ بتادیا۔ مجھے یقین تھا‘ مدیحہ کسی صورت نہیں مانے گی اور ایسا ہی ہوا مگر اس سے بھی بہتر آپشن میرے پاس تھا۔

”میں خود تمہارے ساتھ ہوں مدیحہ! میں جانتا ہوں کہ شازمین ایک دولت منداور بارسوخ باپ کی بیٹی ہے‘ اسے کوئی بھی رشتہ مل جائے گا جو اس کے معیار کے مطابق ہو مگر میں تو روایت بدلنا چاہتا ہوں۔ میں رحمہ کو اپنانا چاہتا ہوں۔“ میری آواز میں وہ ایک نام لیتے ہوئے ایسا بدلاؤ تھا کہ مدیحہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”کیسی ہے وہ...... پیاری ہے؟“ وہ تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

”بے فکر رہو‘ تم سے زیادہ نہیں۔“ میں نے بے چارگی سے کہا جس پر ہم تینوں کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

مجھے یقین تھا میرے فیصلے پر بابا بھی کوئی اعتراض نہیں کریں گے کیوں کہ اب وقت بدل گیا ہے۔

سوچ بدل گئی تھی...... اب جیت انا کی نہیں محبت کی ہوئی تھی۔

